ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.9. No.1.2026

منشی پریم چند کے افسانوی کرداروں میں تصور خدا کی مختلف جہتیں

رابعہ جلال (پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج پشاور)
پروفیسر ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار (شعبہ اردو، اسلامیہ کالج پشاور)

ABSTRACT

This article comprehensively explores the various dimensions of the concept of God along with its social and psychological aspects within the fictional characters of Munshi Premchand.In Premchand's works, the concept of God is not merely traditional or religious; rather, through his poor, oppressed, and working-class characters, it emerges as a symbol of social justice and morality.While the exploitative upper-class characters in these short stories use religion and God for their own vested interests, God represents hope and the ultimate solace for the lower class.As the class, gender, and social status of Premchand's characters change, their relationship and perspective toward God also shift, reflecting a multi-dimensional approach.The study concludes that Premchand's concept of God is deeply rooted in humanism, where the service of humanity and sincere conduct are identified as the true essence of worship.

منشی پریم چند نے اُردو ادب کو لازوال افسانوی ادب دیا۔ وہ بیسویں صدی میں اُردو اور ہندی دنیا میں ایک قد اور ادیب کی حیثیت سے اُبھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُردو فیکشن کے حوالے سے علمی ادیب بن گئے اور اس میں بڑا پن یہ ہے کہ جس وقت وہ ادب کے اُفق پر طلوع ہو رہے تھے اور جس سمت کو پیرائے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کی اُردو ادب میں روایت موجود نہیں تھی۔ میری مراد افسانہ ہے۔ محققین کے محتاط رائے میں اب بھی پریم چند اُردو زبان کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ یہ الگ بحث ہے ۔ کہنا مقصود یہ ہے کہ کسی صنف کی مضبوط روایت کے قد اور شخصیات کا پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن خود روایت کی بنیاد رکھنا ضرور بڑی بات ہے اور پریم چند نے یہی کیا، اگرچہ ان کے سامنے داستان کی ایک مضبوط روایت تھی لیکن افسانہ اور داستان کی زبان میں جو خلیج ہے ایک تو اس کو پھاٹ کرنا خود جان جھوکم عمل تھا۔ دوسرا یہ کہ پریم چند جس ذہنیت کے ادیب تھے اور وہ جس سچائی کو پوٹریٹ کرنا چاہتے تھے یعنی حرفِ عام میں جس حقیقت نگاری کی روایت ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کا داستان کے اظہار سے دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ شمیم حنفی صاحب لکھتے ہیں:

> "پریم چند نے تین سو کے قریب کہانیاں لکھی ہیں۔ ان میں کچھ بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ کچھ اتنی ہی معمولی۔ خیر اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کہ بڑا ادیب ہمیشہ معیار کی ایک ہی سطح پر قائم نہیں رکھ پاتا۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے۔ جب طریقہ کار غیر فطری، مصنوعی اور میکانکی ہو۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

پریم چند کا تخلیقی سفر اس اعتبار سے کہانی کی روایت کا سفر ہے کہ اس میں بقول کملیشور کہانی کے بدلتے ہوئے روپ یعنی داستان اور تصوریے سے افسانے تک بکھرے ہوئے رنگوں کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے"[۱]

سنجیدہ ادیب کی پہچان اس کے کام سے ہو جاتا ہے۔ شمیم حنفی کی اس عبارت کے آغاز میں جہاں ان کے افسانوں کی تعداد کا تذکرہ موجود ہے۔ وہاں معیار کی بات بھی اُٹھائی گئی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ معیار کی تدریس ہی میں ان سے اتنے افسانے لکھوائے اور تب ہی اُردو کے اکثر صاحب رائے تنقید نگاروں نے ان پر قلم اُٹھایا۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے۔ توضمناً یہ بحث اس تمہید سے متعلق ہے کیونکہ خدا ایک آفاقی موضوع ہے اور بڑی تہذیبیں اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ بجز اقرار کی کوئی صورت نہیں لیکن اقرار کے مدارج اور اظہار مختلف ہے۔ اس لیے یہ ایک آفاقی مسئلہ ہونے کی نسبت آفاقی موضوع بن جاتا ہے اور دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اس موضوع پر ادب تخلیق ہوا ہے اور پریم چند جو بذات خود ایک آفاقی کاوش کے ادیب تھے۔ ان کے ہاں یہ موضوع کیسے نظر انداز ہوتا۔ بہر کیف اس موضوع پر نقطہ نظر سے پہلے یہ بات اپنی جگہ انتہائی اہم ہے۔ کہ لکھنے والا خود کس تصورِ خدا سے وابستہ ہے۔ جس کو عرفِ عام میں مذہب کہتے ہیں۔ مذہب ہی خدا کی تصور پر دلالت کرتی ہے۔

پریم چند کا تعلق ہندو مذہب سے تھا لیکن ہندو مذہب ایسا نہیں ہے کہ اس کا تصورِ خدا اسلام کی طرح صاف اور واضح ہو بلکہ وہ کافی گنجلک اور کثرت پرستی کا بین ثبوت ہے۔ پریم چند کے نام میں اس کا یہ تصور پنہاں ہے۔ ان کا اصل نام "دنپت رائے شری واستو" تھا۔ اب اگر اسلام کے آخری لاحقے کو دیکھا جائے تو شری واستو کی حیثیت وہی ہے۔ جو ہمارے ہاں عبداللہ کی ہے لیکن پھر وہی بات کہ یہ لفظ اللہ کی طرف واضح نہیں۔

شری واستو سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ جس کا بنیادی لغوی مطلب۔ "وہ شخص جس میں خدا یا خوشحالی بستی ہو" یہ لفظ دو حصوں سے مل کر بنا ہے۔ شری کا معنی "دولت، خوشحالی، عزت، برکت یا دیوی لکشمی" کے ہیں۔ جبکہ واستو سنسکرت کے لفظ واستویہ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "رہنے والا مکان یا مسکن" کے ہیں۔ شری واستو کا خاندانی پس منظر یہ ہے۔ کہ یہ کائستھ برادری کی ایک شاخ ہے۔ تاریخ میں اس قبیلے کے لوگ شاہی درباروں میں خساب رکھنے کے نگران ہوتے تھے۔ یہ منشی کا سابقہ بھی ایسی مناسبت سے ہے۔

شری واستو برادری خود کو بھگوان چترگیت کی اولاد مانتی ہے۔ ہندو عقائد کے مطابق چترگیت کائنات کے خالق ہندو برہما کے ذہن سے پیدا ہوئے تھے اور وہ انسانوں کے اچھے اور برے اعمال کا حساب کتاب رکھتے ہیں اور اس کا تذکرہ ہندوؤں کی پرانک روایات میں ملتا ہے۔ جس کی ذمہ داری یَم دیوتا سے منسلک ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

اس پوری تفصیلات کا یہاں تذکرہ اس لیے مذکور تھا کہ پریم چند کس مذہبی گھرانے سے منسلک تھے لیکن یہ انسلاک محض موروثی تھا۔ دیگر بہت سے شخصیات کی طرح پریم چند بھی مذہب بیزار تھے اور اس کے شواہد مختلف جگہوں پر ملتے ہیں۔ مثلاً ان کا دوست نند کمار ان کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "ایک بات پر اکثر ان کے ساتھ بات چیت ہوتی تھی اور وہ ہے۔ ایشور اور دھرم۔ وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ دیکھتے تھے کہ اشور اور دھرم اچھے سے زیادہ برے کام میں لائے جاتے ہیں۔ پوچھئے دنیا میں زور ہے۔ ظلم ہے۔ لوگ ستائے جاتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں۔ چاروں طرف تو دکھ کی چیخ پکار ہے۔ تم اس ایشور کو مانو گے جو اس سب کی اجازت دیتا ہے۔ میں نے دیکھا ایسے وقت ان کی قوتِ گویائی کم ہو گئی ہے اور آنکھوں میں چمک آگئی ہے۔ یا تو دنیا کے دکھ کی چیخ اس وقت بھی ان کے کانوں کے اندر پڑ رہی ہے اور وہ انہیں چھین نہ لینے دینا چاہتی ہے"[۲]

اس قسم کا رجحان جدید طرزِ زندگی کے پروردہ افراد کے ہاں یکسر پایا جاتا ہے۔ کال مارکس کی نظریہ معیشت کے دلدادہ افراد کے ہاں بالعموم اور لبرل طرزِ زندگی کے نزدیک افراد کے ہاں بالخصوص خدا کے معاملاتِ زیست کے خیر و شر میں فی الفور عمل دخل کے عدم موجودگی ہی اس کی انکار کی ضمانت ہے۔ خدا اگر ہے تو پھر یہاں اتنی ناانصافی کیوں ہے۔ یہ اور اس قبیل کے سینکڑوں سوالات ملحدین کے ہاں پائے جاتے ہیں جبکہ اس کے برعکس منشی پریم چند کو اس نہج کہ ملحد نہ تھے کہ وہ خدا کے وجود کی نفی کے پرچاوک تھے۔ بس وہ اس میں عافیت سمجھتے تھے کہ معاملاتِ زندگی کی درستی اور معاشی اعتدال کے لیے کاوش کی جائے۔ خدا ہے یا نہیں اس میں منشی پریم چند کے ہاں صلاحیتیں صرف کرنا بیکار ہے اور اس کا اظہار انہوں نے افسانوں کے اندر بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں خدا کی اقرار اور انکار دونوں طرح کے کردار پائے جاتے ہیں چونکہ افسانہ نگار کی ذمہ داری سماجی اور معاشرتی سطح کی ذہنیت کے حامل افراد کی عکاسی مقصود ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مصر اور منکر دونوں طرح کی کردار پیش کرتے ہیں اور چونکہ معاشرے میں مصر یعنی اقرار کرنے والے افراد زیادہ ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں کے کردار بھی زیادہ ہیں۔ ذیل میں ان کے افسانوں کا تصورِ خدا کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

"دست عیب" منشی پریم چند کے معمول کی طوالت کا افسانہ ہے۔ ان کے معمول کے افسانوں کی جتنی طوالت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کم و بیش اتنا ہے۔ اس کا بنیادی موضوع زندگی کے جھمیلے ہیں یعنی گھر کی سربراہ کی حیثیت سے ایک فرد جس طرح رزق کے بارے میں متفکر ہوتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بعینہ اس کی عماز ہے۔ لالہ جیون داس اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ جو کئی مہینوں سے بستر مرگ پر پڑا شدید بیمار تھا اور اس بیماری کی وجہ سے ان میں ایک عجیب چھڑ چھڑاپن پیدا ہو گیا

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

تھا۔ خصوصاًان لوگوں سے ان کو دقت ہوتی تھی جو بیمار پرسی کے لیے آتے تھے۔ تو خود کی بیماری کا سن کر وہ خوشگوار محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس اپنے اور کنبے کا سوچ کر وہ پریشان ہوتا۔

"وہ مستقل مزاج آدمی تھے۔ سزا وہ جزا، عذاب و ثواب کے مسئلے کے دائرہ فکر سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ نامعلوم دہشت کا بھی ان پر غالبہ نہ تھا۔ آئندہ کی جانب سے وہ بالکل بے فکر تھے۔ مگر اس کا باعث ان کا ذہنی جمود نہ تھا بلکہ فکرِ دنیا نے فکر عقبیٰ کی گنجائش نہ باقی رکھی تھی۔ ان کا کنبہ بہت مختصر تھا۔ بیوی تھی اور ایک خورد سال بچہ۔ مگر مزاج میں ریاست کی بُو تھی اور حوصلہ فراخ۔ نفی اثبات پر غالب رہتی تھی۔ اس طرف پر اس طولانی اور لاعلاج مرض نے نفی پر کئی درجوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ میرے بعد ان بیکسوں کا کیا حشر ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی ان کے دل میں ایک ہیجاں سا برپا ہو جاتا تھا۔ ان کے نباہ کیسے ہو گا؟ یہ کس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے ؟ کون ان کی خبر لے گا؟ آہ! میں نے شادی کیوں کی۔ صاحب عیال کیوں بنا۔ کیا اسی لیے کہ یہ دنیا کے احسان بارد کے دست نگر بنیں"[۳]

عیال کا غم اور خصوصاً معاش کے حوالے سے یہ غم ایک فطری چیز ہے لیکن اس کو سویانِ روح نہیں بنانا چاہیے اور عموماً یہ غم ان لوگوں کے ہاں زیادہ ہوتا ہے جو خدا اور مذہب سے بیزار ہوتے ہیں۔ جن کے ہاں سب کچھ ہی مادی چیزیں ہوتی ہیں۔ جو اسباب وعلائل کو ہر مسئلے کا حل گردانتے ہیں اور مشکلات کی آسانی تصور کرتے ہیں۔ جیون داس بھی اس نہج کا کردار تھا اور یہی چیز انہیں الحاد کی طرف لے کر چلی گئی۔

"ان خیالات نے ان کے دل میں فلسفیانہ شکوک پیدا کرنے شروع کیے۔ مادی تعلیم نے انہیں پہلے ہی بدیہہ پرست بنا دیا تھا۔ اب انہیں سارا نظامِ عالم پُر فریب اور سفاک نظر آنے لگا۔ یہاں انصاف نہیں، رحم نہیں، ہمدردی نہیں۔ غیر ممکن ہے کہ یہ نظام کسی ذاتِ کریم کے مطیع ہو اور اس کے علم میں ایسی ایسی بدعتیں ایسی ایسی جفا شعاریاں ایسی ایسی کرشمہ سازیاں وقوع میں آتیں۔ وہ نہ رحیم ہے۔ نہ کریم۔ وہ علیم۔ خبیر بھی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ ذات شریر، خبیث کج رو اور ستم شعار ہے"[۴]

تشکیک الحاد کی پہلی کڑی ہے۔ خدا بیزاری اور خدا سے انکار کے بعض وجوہات کلاسک ہیں۔ پرانے دور میں اس کی رمق اگرچہ کم تھی مگر وہ جو ہاتا کثر ظلم و ستم اور انسان کا انسان کے ساتھ بہیمانہ رویے کی پیداوار تھا جبکہ جدید دور میں الحاد نے مختلف عوامل پیدا کر دیے ہیں۔ مذکورہ عبارت میں تقریباً دونوں سطح کا اپروچ موجود ہے۔ جیون داس کا الحاد حالات کی پیدائش کی رہین منت ہے۔ بیماری نے انہیں عیال کی پرورش کی طرف متوجہ کر دیا اور یہ سوچ سوچ کر وہ خدا کا ہی منکر ہوا اور نہ صرف منکر بلکہ ضمیر کو ہلکا کرنے کے لیے تعن و تشنیع پر اتر آیا۔ جو کہ نفسیاتی اعتبار سے ایک ڈیپیسرس ذہن کی علامت ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

جس ذہنیت میں یہ خناس بھر جاتے کہ یہ عالم رنگ و بو کا کار خانہ انصاف سے نہیں چل رہا یا حرفِ عام میں اس کو چلانے والا منصف نہیں ہے یا وہ بالواسطہ اس متعلق نہیں ہو سکتے بلکہ معذور ہے۔ اس قسم کے خیالات اور اشکالات مکمل طور پر مذہبی تعبیرات سے نہ آشنائی کی دلیل ہے۔ وہ اس دنیا کے متعلق وہ تصور نہیں رکھتے جو لازم ہے۔ یہ دنیا دارالامتحاں ہے اور امتحانات کے ساتھ آزمائش اور مصائب منسلک ہیں۔ یہ مثالی زندگی اور مثالی رہن سہن بننا، عقلاً محال ہے۔ اگر اس کے لیے دوڑ دھوپ اور کاوش کی جائے تو نتیجہ وہ دو جمع دو چار جیسا عیاں ہے۔ کہ اپنے زورِ بازو پر اس کو جنت بنانا عبث خواری ہے۔ تو سوچ کے موافق نتائج کا نہ ملنا بالآخر جیون داس جیسی تشکیک پیدا کر لیتا ہے۔ یہ امر اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کو ہی مشکلات کا سامنا ہے مگر اگر حقیقت کو آزمائش کے تناظر سے دیکھیں گے تو انسان بھی اپنے جیسے انسان کے لیے آزمائش ہے اور یہ آزمائش جنت میں ختم ہو گی۔

دوسری بات جو مذکورہ عبارت سے عیاں ہے۔ وہ جدید دور کے الحاد کی صورت ہے۔ اکثر مذاہب کے دنیا کی معلوم تاریخ پر نظر دوڑوائی جائے تو کم ہی لوگ نظر آتے ہیں۔ جو ملحدین تھے۔ مذہب بیزار یا مذہب سے دور معاشرہ تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ دنیا نے پہلی دفعہ اس صدی دو میں ممالک کی یہ تو صورتیں دیکھی۔ جس کا بنیاد انسان کی مدر پدر آزادی اور مذاہب بیزاری پر ہے اور اس کی ہوا یورپی دنیا میں کم و بیش دو تین صدیوں پہلے چلی۔ جہاں یہ تصور عام ہوا کہ مذاہب ہی مسائل کے جڑ ہیں اور تب مذہب انسان کا ذاتی اور انفرادی فعل گردان کر ریاستی اُمور سے توڑا دیا گیا اور اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ ریاست وجود میں آئی اور یہ بد قسمتی سے پچھلی صدی سے قبل دنیا کے امور سنبھالنے کا موقع ان ہاتھوں میں چلا گیا اور نتیجتاً ہر علاقے میں کم و بیش یہ ذہنیت کے لوگ پیدا ہوئے۔ منشی پریم چند نے جب یہاں تعلیم کی بات کی ہے اسی طرف اشارہ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی کی نظامِ تعلیم کو یہاں کے بیشتر صاحبِ نظر لوگوں نے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ خود منشیپریم چند نے اس کا اظہار مختلف افسانوں میں کیا ہے لیکن چند اس کو اس واسطے زیرِ عتاب نہیں کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے تشکیک کی راہ کھل رہی ہے بلکہ ان کا مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ البتہ ان کے سامنے یہ بات بھی واضح تھی کہ تشکیک میں اس تعلیم کا اہم کردار ہے۔ جس طرح مذکورہ افسانوی عبارت سے ثابت بھی ہے۔ اور ہے بھی ایسا۔ اصل میں ہندوستانی سماج اور کچھ حد تک یہاں بھی اگر اس نوعیت کی ذہنیت ملتی ہے۔ تو اس کے پیچھے بنیادی وجہ یہی نظامِ تعلیم ہے اور اسی وجہ سے اکبر الٰہ آبادی نے سر سید احمد خان کی مخالفت کی تھی۔ اُنہوں نے کئی جگہ اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ تجریدی فلسفہ پڑھنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ محض تشکیک کے لیے راہ ہموار ہو گا۔ وہ اکثر سر سید کو کہا کرتے تھے کہ اگر وہاں کی تعلیم ل لاتی ہے۔ تو عملی سائنس کے لیے کوششوں کی جائے نہ کہ بے بنیاد تجریدی فلسفے کی۔ کیونکہ اس سے شک کی بنیادیں پڑتی ہیں اور اسی سے ملتی جلتی رائے علامہ اقبال کے ہاد بھی ملتی ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

خوش تو تھے، ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلے آئے گا الحاد بھی ساتھ

اس قسم کی سوچ یا اظہار منشی پریم چند کے ہاں کہی نہ کہی ملتا ہے لیکن ان کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ کوئی آدمی مذہب کو پسند کرتا ہے کہ نہیں۔ کوئی آدمی خدا پر یقین رکھتا ہے کہ نہیں بلکہ وہ خود جس فلسفے سے متاثر تھے۔ اس میں خدا کے لیے جگہ نہیں تھی۔ وہ جس معاشی اعتدال کی بات کر رہے تھے۔ اس سوچ کے حامل لوگوں کے ہاں مذہب بذاتِ خود افیون تھا اور نشے کا کام کرتا تھا بلکہ منشی پریم چند کو اگر اس سے مسئلہ تھا تو ایک خاص قسم کی ذہنیت کا اور اس تعلیم کی وجہ سے بننے والے اشرفیہ کا۔ جس کا اظہار شبیر بخاری کی عبارت میں پایا جاتا ہے۔

"اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ انگریزی نظام تعلیم ایک نئی ہندوستانی اشرفیہ پیدا کرنے کی غرض سے رائج کیا گیا۔ جو باہر سے ہندوستانی مگر اندر سے انگریز ہو"۵

حوالہ جات

(۱) گوپی چند نارنگ، اُردو افسانہ روایت اور مسائل، مشمولہ پریم چند کی افسانہ نگاری، از شمیم حنفی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص، ۱۸۱

(۲) قمر رائیس ،ڈاکٹر، منشی پریم چند ، شخصیت اور فن، مشمولہ، پریم چند چند یادیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء، ص، ۹۰

(۳) کلیات منشی پریم چند، مرتبہ، مدن گوپال، مشمولہ، دستِ عیب، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان دہلی ۲۰۰۱ء، ص، ۴۵۷، ۴۵۶

(۴) ایضاً، ص، ۴۶۲

(۵) شبیر بخاری، میکالے اور برصغیر کی نظامِ تعلیم، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۸۸ء، ص، ۶۵